''دینی مدارس کا تاریخی پس منظر

حضرت مولانا مفتی رفیع عثمانی صاحب

میں اس وقت دارالعلوم کراچی، دارالعلوم دیوبند اور دینی مدارس کے سلسلے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، میں نے ابھی قرآنِ کریم کی یہ آیت تلاوت کی ہے:

﴿لقد من الله على المومنين اذ بعث فيهم رسولا من انفسهم يتلوعليهم ياته ويز كيهم يعلمهم الكتب والحكمة ۚ وان كانو امن قبل لفى ضلل مبين﴾

اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ اللہ رب العالمین نے اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے چار مقاصد بیان فرمائے ہیں، مجمع علمائے کرام کا ہے، لہٰذا مجھے اس آیت کی تفسیر بیان کرنے کی ضرورت تو نہیں ہے، لیکن چونکہ حضرات علمائے کرام کی برکتوں سے بہرہ ور ہونے کے لئے الحمدللہ شہر کے معززین اور عوام کا بھی بہت بڑا مجمع موجود ہے، اس واسطے اہلِ علم سے معذرت کے ساتھ، میں اس آیت کی تھوڑی سی تشریح کرتا ہوا آگے بڑھوں گا۔

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے چار مقاصد میں سے پہلا مقصد یہ بیان فرمایا گیا کہ: ﴿يتلو عليهم ياته﴾ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک کام یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآنِ کریم کی آیات پڑھ کر لوگوں کو سنائیں اور ظاہر ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ سننے والے بھی ویسا ہی پڑھیں یہ الفاظِ قرآن کی تعلیم ہوئی۔

دوسرا مقصد بیان فرمایا: ﴿وَيُزَكِّيهِمْ﴾ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اخلاق اور اعمال وافعال اور عقائد کا تزکیہ کریں، اصلاح کریں، تزکیہ کا حاصل تربیت ہے۔

تیسرا مقصد یہ بیان فرمایا کہ: ﴿ويعلمهم الكتب﴾ قرآن کریم کی تعلیم دیں، یعنی قرآنِ کریم کے معنی سمجھائیں کیونکہ الفاظ قرآن سکھانے کا ذکر تو ﴿يتلو عليهم ياته﴾ میں آگیا ہے تو ﴿ويعلمهم الكتب﴾ کا حاصل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کے مطالب اور معانی اور اس کے حقائق لوگوں کو سمجھائیں، اس کی تعلیم دیں۔

اور چوتھا مقصد یہ بیان فرمایا کہ ﴿ والحکم ﴾ لوگوں کو حکمت کی تعلیم دیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سنت کی تعلیم دیں۔ تو چار مقاصد ہوئے: (۱) ایک آیات قرآنیہ کا پڑھنا سکھانا، (۲) دوسرے اعمال و اخلاق وعقائد کا تزکیہ کرنا، (۳) تیسرے قرآنِ کریم کے معانی ومفاہیم اور مطالب سمجھانا، (۴) چوتھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی تعلیم دینا۔ یہ چار مقاصد بعثت بیان فرمائے ہیں، دیکھا جائے تو ان چاروں کاموں کا خلاصہ دو کام ہیں یعنی (۱) تعلیم اور (۲) تربیت۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم وتربیت کا کام مکہ معظمہ کی زندگی سے شروع فرمادیا تھا اور بسا اوقات آپ کو روپوش ہوکر پوشیدہ طور پر بھی یہ کام کرنا پڑا۔ دارِارقم میں یہ سلسلہ شروع ہوا، اگر کہا جائے کہ اسلامی تعلیم کا سب سے پہلا مرکز دارِارقم ہے تو اس لحاظ سے مبالغہ نہیں ہوگا کہ مکی زندگی کا سب سے پہلا تعلیمی مرکز دارِارقم تھا۔

صُفّہ کا مدرسہ: مسجدِ نبوی ہی کے ایک حصے میں صُفّہ نامی ایک چبوترا ہے، اسے مدینہ منورہ میں آپ اسلام کا باقاعدہ مدرسہ سمجھ لیں، ہجرت کے بعد اس صُفّے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی ایک بڑی جماعت زیرِ تعلیم رہی، ان میں سب سے زیادہ شہرت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حاصل ہوئی جو یمن سے آئے تھے، اپنے گھربار اور تمام معاشی مشاغل کو چھوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں آپڑے تھے، اور تقریباً یہی حال باقی تمام اصحابِ صُفّہ کا تھا، جن کا مقصد یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بھی علم حاصل کریں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی نمونے سے بھی علم حاصل کریں، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآنِ کریم کی تفسیر وتعلیم اپنی زبان سے بھی فرماتے تھے اور اپنے عملی نمونے سے بھی۔ قرآن میں جہاد کا حکم ہے تو جہاد کس طرح کیا جائے، وضو کا حکم ہے تو وضو کس طرح کیا جائے گا، نماز کا حکم ہے تو نماز کیسے پڑھی جائے گی، زکوٰۃ کا حکم، روزے کا حکم، اِعتکاف کا حکم، قربانی کا حکم، تبلیغ کا حکم، عدالت وانصاف کا حکم، اسلامی حکومت کے قیام کا حکم، عدالتوں اور سیاسی حکومتوں کے معاملات کے احکام، جہاد، صف بندی، دشمنوں کے ساتھ مقابلہ، دوستوں کے ساتھ تعلقات، دشمنوں کے ساتھ معاہدات، خرید وفروخت، معاشی نظام کیسے ہوگا، ان سب قرآنی اَحکام پر عمل کا نمونہ عملی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کرکے دکھایا۔ اور یہ سب قرآن کی تفسیر تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عاداتِ شریفہ کیا تھیں؟ تو انہوں نے فرمایا: ﴿ کان خلقه القرآن ﴾ یعنی ان کی عادات وہ تھیں جو قرآن ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ پورے قرآن کا عملی نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ تھی، تو اصحابِ صُفّہ قرآن سے تعلیم حاصل کررہے تھے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا، اور کتابی شکل میں موجود تھا، اور اس کے عملی نمونہ سے تربیت حاصل کررہے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی میں موجود تھا۔ اس مدرسے کی نصابی کتاب قرآنِ کریم تھی، استاذ تھے تاجدارِ دوعالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، اور شاگرد تھے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم، یہ ایسا بے مثال

مدرسہ تھا کہ زمین وآسمان نے ایسا مدرسہ کبھی نہیں دیکھا۔ ایسا استاذ زمین وآسمان نے اس سے پہلے کبھی دیکھا تھا نہ اس کے بعد کبھی دیکھا، اور نہ دیکھیں گے، اور شاگرد بھی زمین وآسمان نے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بعد ایسے نہیں دیکھے جیسے اس مدرسہ میں زیرِ تعلیم تھے۔

اصحابِ صُفّہ کا حال: اصحابِ صُفّہ کا حال یہ تھا کہ یہ فکر کئے بغیر کہ کھائیں گے کہاں سے، اللہ پر بھروسہ کرکے تاجدارِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں آپڑے تھے، چنانچہ ان کا کوئی ذریعۂ معاش نہیں تھا، بعض اوقات کئی کئی وقت کے فاقے بھی گزر جاتے تھے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود فرماتے ہیں کہ مجھ پر ایسے اوقات بھی گزرے ہیں کہ طویل فاقہ ہوا اور میں مسجدِ نبوی کے کسی حصے میں بھوک سے نڈھال ہوکر فرش پر پڑا ہوتا تھا، میرے اندر اتنی بھی طاقت نہ ہوتی تھی کہ بیٹھ سکوں، اتنی بھی سکت نہیں تھی کہ لوگوں کو بتا سکوں۔ لوگ سمجھتے تھے کہ میں بے ہوش ہوں، لیکن میں ہوش میں ہوتا تھا، ان کی باتیں سُن رہا ہوتا تھا، سمجھ رہا ہوتا تھا، لیکن فاقہ کے ضعف اور کمزوری کی وجہ سے زبان سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ بعض اوقات اس حالت میں مجھے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا تو انہوں نے میرے کھانے کا انتظام کیا۔

اس طرح اللہ پر بھروسہ کرکے، توکل کرکے یہ جماعت صُفّہ کے اندر آپڑی تھی، ایک ایک وقت میں ان کی تعداد اسّی (۸۰) تک بھی رہی، البتہ مدینہ طیبہ میں جو باقی حضرات صحابہ کرامؓ تھے، ان میں سے زیادہ تر حضرات تو محنت مزدوری میں لگے ہوئے تھے، کچھ حضرات کے کھجوروں کے باغات تھے، اور کچھ حضرات تجارت میں لگے ہوئے تھے، ان کو جیسے بھی ذریعۂ معاش حاصل تھا اُس میں سے وہ اپنے بال بچوں کو جو روکھی سوکھی کھلاتے تھے اسی میں سے کچھ حصہ اصحابِ صُفّہ تک پہنچا دیتے تھے، چنانچہ صُفّہ کے پاس مسجدِ نبوی کے دروازے کے طور پر جو دو کھجوروں کے تنے کھڑے ہوئے تھے ان میں مدینے کے کچھ لوگ آکر کھجوروں کے خوشے لٹکا دیا کرتے تھے تاکہ اصحابِ صُفّہ ان سے بھوک مٹالیں، فقر وفاقے کا زمانہ تھا، یہ فاقہ کش اور بوریہ نشین جماعت تھی، بلکہ یہ تو ایسی جماعت تھی کہ انہیں بوریا بھی شاید ہی نصیب ہوا ہو۔

صُفّہ کے مدرسہ کے فاضلین: یہ جماعت فارغ التحصیل ہوکر اس مدرسہ سے نکلی تو ایک تاریخ ساز جماعت ثابت ہوئی۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت سے آپ کی وفات تک کل تیئیس (۲۳) سال کی تعلیم وتربیت مکہ مکرمہ اور مدینہ میں ملی تھی، صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اس مقدس جماعت نے ایسے کارنامے دُنیا کو دِکھائے کہ آج تک دُنیا حیران ہے، مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد دس سال کے اندر اندر پورے جزیرہ نمائے عرب پر اس جماعت کی حکمرانی قائم ہوچکی تھی، جب جزیرہ نمائے عرب کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے صرف سعودی عرب مراد نہیں ہوتا، بلکہ اس میں سعودی عرب، بحرین، کویت، ابوظبی، دبئی، شارجہ، قطر، عُمان، مسقط اور تمام خلیجی ریاستیں داخل ہیں، یعنی کم وبیش ایک درجن چھوٹے بڑے ممالک اور ریاستوں کے مجموعے کا نام ''جزیرۂ نمائے

عرب" ہے۔

اس جزیرہ نمائے عرب پر صُفّہ کے مدرسے کے اسی استاد اور معلم کی حکمرانی تھی جو پیٹ پر دو دو پتھر باندھ کر کبھی نماز کی اِمامت کرتا تھا اور کبھی میدانِ جہاد میں اللہ کے راستے کے شیدائیوں کی قیادت فرماتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمرانی اس پورے جزیرہ نمائے عرب پر قائم تھی، اور صحابۂ کرامؓ ہی کی مقدس جماعت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شاگرد تھی، یہی آپ کے اعوان وانصار تھے۔ ہجرت کے سال سے مدینہ طیبہ میں اسلامی حکومت کا آغاز ہوا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا دور: دس سال بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی، صحابۂ کرامؓ کا دورِ حکمرانی آیا، تیس سال وہ مقدس خلافتِ راشدہ قائم رہی جس نے دُنیا پر مثالی سیاست وحکومت کے ان مٹ نقوش چھوڑے، اس نے عدل وانصاف، امن وامان اور علم وحکمت کے میدانوں میں عظیم الشان کارنامے انجام دیئے، دُنیا کو یہ بتلایا کہ کامیاب حکومت اور ایک عظیم الشان فلاحی ریاست کا نمونہ کیا ہوتا ہے؟ یہ خلافت راشدہ کا مقدس دور ہے، اس دور میں صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے لوگوں کے دِلوں کو جیتا اور جہاں چلے گئے دشمن اقوام نے اپنے دروازے ان کے لئے کھول دیئے، کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ یہ علم وحکمت کے مینار، یہ انصاف قائم کرنے والے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہمارے ملک میں باپ جیسی محبت کرنے والے حکمران بن کر آرہے ہیں، یہ عدل وانصاف کے جو دنے پیچھے قائم کرتے چلے آرہے ہیں، ہمارے ملکوں میں اور ہمارے علاقوں میں بھی قائم کریں گے۔

اسلام تلوار کے بجائے حقانیت کے زور سے پھیلا ہے: یہ ہمارے دشمنوں کا پروپیگنڈہ ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ہے کہ عہدِ رسالت یا عہدِ صحابہ میں کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کے لئے اس کی گردن پر تلوار رکھ کر یہ کہا گیا ہو کہ کلمہ ﴿لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ﴾ پڑھو، اسلام میں ﴿لا اکراہ فی الدین﴾ کا اعلان ہے کہ دین میں کوئی اکراہ یا زبردستی نہیں ہوسکتی، حق اور باطل تمہارے سامنے کھل کر آگیا ہے، جس کا جی چاہے حق کو اختیار کرکے جنت کا رہائشی بن جائے، اور جس کا جی چاہے باطل پر جمارہے اور جہنم کا ایندھن بن جائے۔ بہرحال اسلام میں زبردستی نہیں ہے کہ تم ضرور اسلام لاؤ، اور کلمۂ توحید پڑھو، ہاں تبلیغ ہے، تعلیم ہے۔ جو چاہے اس تبلیغ وتعلیم کو قبول کرلے، اور جو چاہے باطل پر جمارہے۔

خیر! یہ مقدس جماعت تبلیغ کے لئے اور اللہ کا پیغام دُنیا کو پہنچانے کے لئے جزیرۂ نمائے عرب سے نکلی اور جہاں جہاں ظالم وجابر بادشاہوں اور حکمرانوں نے اس تبلیغ کی راہ میں رُکاوٹیں کھڑی کیں اُن کو دعوتِ اسلام دی، اور جزیہ کی شرط پر مصالحت کی پیشکش کی، جنہوں نے مصالحت کی اس پیشکش کو بھی نہ مانا، اُن سے جہاد کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرامؓ کے بازُوں میں وہ طاقت دی تھی، ان کی تلواروں میں وہ تیزی رکھی تھی کہ انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے چند سالوں کے اندر قیصر وکسریٰ کی طاغوتی طاقت کا یعنی دُنیا کی دونوں ظالم سُپر طاقتوں کا خاتمہ کردیا، اور دُنیا کو ان کے مظالم سے

نجات دِلا کر وہاں اسلام کا عدل وانصاف قائم کیا، اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں تو اسلام یہاں مکران کے قریب تک آچکا تھا۔ اُدھر آذربائیجان اور قفقاز کے ممالک فتح ہو چکے تھے اور افریقہ کے بہت سارے ممالک اسلام کے زیرِ نگین آچکے تھے، تقریباً پچیس سال کے عرصے میں یہ انقلاب رُونما ہو گیا تھا کہ دُنیا کی دو سُپر طاقتوں کا خاتمہ کر کے اسلام دُنیا کی واحد سُپر طاقت بن چکا تھا، لیکن یہ صرف تلوار کے زور سے نہیں بلکہ حقانیت کے زور سے ہوا، علم وحکمت اور مثالی اخلاق کی بنیادوں پر انصاف اور انسانیت کے رکھوالوں نے اپنے حسین کردار کے عملی نمونے قائم کر کے دِکھلائے تھے، یہی وجہ ہے کہ انہیں بہت زیادہ طاقت بھی استعمال نہیں کرنی پڑی، زیادہ تر وہیں کے عوام نے مجاہدین کے لئے راستے کھولے، اپنے جابر وظالم حکمرانوں کے خلاف بغاوت کر کے ان کا استقبال کیا، اور مسلمانوں کو اپنا سرتاج بنایا، اس طرح اسلام وہاں لوگوں کی رضا ورغبت سے پھیلتا گیا۔

یہ اسلام پھیلانے والے کون تھے؟ وہی ''دارِ ارقم'' اور ''صُفّہ'' کے فاقہ مست بوریا نشین طلبہ اور فارغ التحصیل علماء جو جزیرہ نمائے عرب سے نکلے تو اس وقت اُونٹوں کی مہاریں ان کے ہاتھوں میں تھیں، لیکن چند ہی سال بعد دُنیا نے دیکھا کہ قوموں کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں آگئی، اور اسلام دُنیا کی سب سے بڑی طاقت بن گیا۔ یہ فیض تھا اُس درسگاہ کا اور اس کے معلم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ آپ نے ایک ایسی مقدس جماعت تیار کر دی تھی جن کو دیکھ دیکھ کر لوگ مشرف بہ اسلام ہو رہے تھے۔

مالدیپ اور مالابار میں اسلام کیسے پھیلا؟: عام طور پر یہ مشہور ہے کہ ہندوستان میں اسلام سے پہلے سندھ کے علاقے میں آیا، لیکن تاریخی حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہندوستان میں سب سے پہلے مالابار میں آیا جو اَب بھارت کے جنوبی صوبے کرالہ کا بڑا ساحلی علاقہ ہے، تاریخ فرشتہ کے بیان کے مطابق تجارت کے سلسلے میں عربوں کی آمد ورفت پہلے ہی سے مالابار میں تھی، لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا حال مالابار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے میں لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا، اُس زمانے میں مالابار کا راجہ زمون یا ''سامری'' کے نام سے مشہور تھا، اس راجہ نے معجزۂ ''شق القمر'' کو دیکھ کر اس عجیب واقعہ کے متعلق تحقیق شروع کی اور اس واقعے کو بطور یادداشت سرکاری روزنامچے میں درج کرایا، بالآخر اسے معلوم ہوا کہ سرزمینِ عرب میں ایک پیغمبر پیدا ہوئے، اور ان کے ہاتھوں یہ معجزہ رُونما ہوا ہے، یہ سن کر راجہ نے اسلام قبول کر لیا، اور تخت وسلطنت اپنے ولی عہد کو سپرد کر کے خود کشتی کے ذریعے سرزمینِ عرب کی طرف روانہ ہوا، لیکن راستے ہی میں وفات پائی اور یمن کے ساحلی علاقے میں مدفون ہوا۔ پھر عرب تاجروں کے ذریعے مالابار میں اسلام پھیلنا شروع ہو گیا، اسلام نے اس لئے اور بھی تیز رفتار ترقی کی کہ عرب مسلمانوں کے کریمانہ اخلاق، ہمدردی اور سب کے لئے خیر خواہی، رحم دِلی، سچائی اور رواداری نے اُن کے دِل جیت لئے۔ وہ ذات پات کی بندشوں کو دُور کر کے مظلوم ومغلوب انسانوں کے لئے ابرِ رحمت ثابت ہوئے، ان کی تجارت نے اُس ملک کی ترقی کا

سامان کیا۔

چنانچہ مالا بار کا ایک اور راجہ جس کا نام ''عجائب الانظار'' کی روایت کے مطابق ''چیرامن پیرومل'' تھا، دُوسری صدی ہجری کے اوائل میں چند مسلمان سیاحوں کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوگیا، اُس نے انتقال کے وقت وصیت کی کہ مالا بار میں تبلیغِ اسلام کا کام پوری مستعدی سے وسیع پیمانے پر جاری کیا جائے۔ جس کے سبب راجہ کی قوم کے آدمی، بکثرت اسلام میں داخل ہوئے۔ اور اسلامی حکومت قائم ہوگئی۔

تقریباً مالدیپ کا پورا ملک جس میں سراندیپ بھی داخل ہے اسلام کے زیرِ نگین آیا، اسلام کی عظیم الشان حکومت وہاں قائم ہوئی، وہی مالدیپ جس کا دارالحکومت آج بھی مالے کے نام سے ہے اور سری لنکا اور کولمبو جاتے ہوئے اس کا ایئرپورٹ راستے میں پڑتا ہے، یہ کئی جزائر کا مجموعہ ہے، وہاں اسلام کس طرح پھیلا؟ یہاں اسلام پھیلانے والے بھی وہ مسلمان تاجر تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں یا شاگردوں کے شاگردوں سے تعلیم حاصل کی تھی، یہ لوگ تجارت کے لئے سراندیپ اور مالدیپ میں آکر آباد ہوئے، یہاں ساری آبادی مشرکین کی تھی، حکومت بھی مشرکین کی تھی، انہوں نے تجارت کا کام شروع کیا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد لوگوں نے دیکھا کہ ان کے حالات کچھ اور ہیں، ان کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، ان کی رفتار، گفتار اور کردار، ان کی تجارت، ہر چیز ہم سے مختلف اور نرالی ہے، لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ مسلمان بھی وہی مالِ تجارت لے کر اسی بازار میں بیٹھتے ہیں اور مقامی لوگوں کے پاس بھی وہی مالِ تجارت ہے، مگر کاروبار مسلمانوں کا بڑھتا ہے ان کا نہیں بڑھتا، رفتہ رفتہ لوگوں نے ملنا جلنا شروع کیا، حالات پوچھے، انہوں نے اسلام کا تعارف کرایا۔

خلاصہ یہ ہے کہ سراندیپ اور مالدیپ میں ان مسلمانوں کو دیکھ دیکھ کر لوگ مسلمان ہونا شروع ہوگئے، حتیٰ کہ بادشاہ بھی مسلمان ہوا، اور اہل دربار بھی مسلمان ہوگئے، اور تھوڑے ہی عرصہ میں لوگوں نے یہ تماشا دیکھا کہ وہ کفرستان اسلامستان میں بدل گیا، یہاں کوئی لشکر کشی نہیں ہوئی، حتیٰ کہ تبلیغ کے قافلے بھی یہاں نہیں پہنچے تھے، یہاں تو تاجر پہنچے تھے، جو اسلام کا پیغام بھی ساتھ لائے تھے ان کا عملی نمونہ دیکھ دیکھ کر لوگ مشرف بہ اسلام ہوتے چلے گئے۔

اس کے بعد مسلمان تاجروں اور سیاحوں کے ذریعے اسلام بحرالکاہل کے ممالک جاوا، سماٹرا (انڈونیشیا)، سنگاپور، ملایا (ملائیشیا) وغیرہ کو طے کرتا ہوا جنوبی چین تک جا پہنچا، ان ممالک میں اسلام کا داخلہ محض تبلیغی طریقوں سے ہوا، جنگ و جہاد کا اس میں دخل نہ تھا۔ یہ کرامت تھی اس درسگاہ کی جس کے مبلغین یہ فارغ التحصیل تھے یا ان کے شاگرد تھے۔ الحمدللہ دارِ ارقم اور اصحابِ صُفّہ سے جو طریقہ شروع ہوا تھا اس کا سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔

حکمت کی بات مؤمن کی گمشدہ متاع ہے: اس سلسلے میں ان کو جو تعلیم ملی تھی اس تعلیم کا ایک اصول یہ بھی تھا کہ: ﴿کلمة الحکمة ضالة المؤمن﴾ یعنی حکمت کی ہر بات مؤمن کی گم شدہ متاع ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ حق

بات، حکمت اور دانائی کی بات جہاں سے ملے، وہ تمہاری اپنی چیز ہے، وہ جہاں سے ملے تم اُسے لے لو، چاہے سے ملے، اپنوں سے ملے، یا دشمنوں سے ملے، اس کو اپنالو، یہ ایک بنیادی نکتہ تھا، چنانچہ بعد میں جب مسلمانوں کی فتوحات پھیلیں، اسلام ایران وعراق، مصر وشام، افریقہ، اندلس اور دُوسرے ممالک میں پہنچا تو وہاں کی تہذیبوں سے بھی واسطہ پڑا، وہاں کی سائنس اور ٹیکنالوجی بھی ان کے سامنے آئی، فلسفے بھی سامنے آئے، وہاں کی طب بھی ان کے سامنے آئی اور انہوں نے ان علوم وفنون کو بھی اپنایا۔

یونانی فلسفہ: یونان کا فلسفہ اسلامی عقائد سے ٹکرا رہا تھا، علمائے اسلام اور مسلم حکمرانوں نے یونانی فلسفے کے عربی میں ترجمے کرائے اور اس میں بھی انہوں نے وہ مہارت حاصل کی کہ خود عظیم الشان فلسفی بن گئے، اور اُس فلسفے میں جو باتیں اسلامی عقائد سے متصادم تھیں، فلسفیانہ دلائل ہی سے ان کا قلع قمع کیا، ارسطو کی ایجاد کردہ منطق ہی سے کام لے کر، اور یونانی فلاسفروں کے طریقۂ استدلال ہی کو استعمال کر کے ثابت کیا کہ فلسفے کے دلائل کا تقاضا وہ مفروضات نہیں جو ارسطو اور افلاطون نے اختیار کئے تھے، بلکہ عقلی دلائل اُن عقائد کی گواہی دیتے ہیں جن کا پیغام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔ غرض! اِمام رازی اور امام غزالی (رحمۃ اللہ علیہما) جیسے علمائے دین اور حکمائے اسلام نے فلسفے کو مشرف بہ اسلام کیا۔

ثابت شدہ سائنسی حقائق کبھی اسلام سے نہیں ٹکراتے: سائنسی حقائق کبھی اسلام سے نہیں ٹکرائے، اور اسلام کبھی سائنسی حقائق سے نہیں ٹکرایا، جب کبھی اسلام کا تصادم ہوا فلسفوں سے ہی ہوا، اور الحمدللہ علمائے اسلام نے فلسفوں کو سمجھ کر ان کے دلائل کو سمجھ کر، ان کے طرزِ استدلال کو اختیار کر کے انہی کے دلائل سے اور انہی کے طرزِ استدلال سے ان کے باطل نظریات کا قلع قمع کیا۔ اِمام فخر الدین رازی اور اِمام غزالی رحمہما اللہ کی مثالیں اس سلسلے میں واضح ہیں، یہ سلسلہ چلتا رہا، ہر زمانے کے علوم وفنون کو اس زمانے کے حکمائے اسلام اور علمائے کرام اپناتے رہے۔ ان کی اصلاح کرتے اور ان کو ترقی دیتے رہے۔

اسلامی نظامِ تعلیم میں دِین ودُنیا کی تفریق نہیں ہوتی: اسلامی نظامِ تعلیم میں دوئی نہیں تھی، ایسا نہیں تھا کہ دِین کی تعلیم الگ درسگاہوں میں ہوتی ہو، دُنیاوی عصری علوم وفنون کی تعلیم الگ درسگاہوں میں ہوتی ہو۔ ہر قسم کے علوم وفنون کی تعلیم ایک ہی درسگاہ میں ہوتی تھی، پھر اُن میں سے بعض لوگ تمام علوم وفنون میں مہارت پیدا کرتے تھے، اور بہت سے حضرات ایسے تھے کہ اُن میں سے کسی نے علم حدیث میں مہارت پیدا کی، جیسا کہ ائمہ حدیث میں اِمام بخاری، امام مسلم، اِمام ابوداؤد، اِمام ترمذی، اِمام نسائی اور دوسرے محدثینِ کرام کہ انہوں نے علمِ حدیث میں کمال پیدا کیا، کچھ حضرات نے علم فقہ میں کمال پیدا کیا، جیسے اِمام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگرد، اِمام مالکؒ اور اُن کے شاگرد، اِمام شافعیؒ اور ان کے شاگرد، اِمام احمد بن حنبلؒ اور ان کے شاگرد، وغیرہم، بہت سوں نے فقہ علم کلام اور فلسفے میں ایک

ساتھ کمال پیدا کیا، جیسے اِمام غزالی رحمہ اللہ۔ بہت سوں نے تفسیر میں کمال پیدا کیا جیسا کہ ہمارے بہت سے مُفسرینِ کرام ہیں، اور اُن میں سے اِمام رازی رحمہ اللہ کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ فلسفے اور حکمت کے اِمام ہونے کے ساتھ تفسیر کے بھی اِمام ہیں تو اس میں مبالغہ نہیں ہوگا۔ تو کچھ حضرات نے خاص خاص علوم وفنون میں تخصصات کیے، لیکن وہ اپنے زمانے کے دوسرے علوم وفنون سے بھی بہرہ ور ہوتے تھے، چاہے وہ دِینی علوم ہوں یا دُنیاوی علوم، کیونکہ اسلام میں تو دِین اور دُنیا کی تفریق ہے ہی نہیں، ایک اچھا مسلمان دُنیاوی علوم وفنون بھی اللہ کی رضا اور مخلوقِ خدا کی خدمت اور ملک وملت کے فوائد کے لئے ہی حاصل کرتا ہے، اس واسطے دُنیاوی علوم وفنون کا ثواب بھی وہی ہوتا ہے جو اِسلامی علوم کا ہے۔

منطق کی کتاب "قطبی" پڑھ کر ایصالِ ثواب: میں نے بعض بزرگوں سے یہ واقعہ سنا ہے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ، جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ جیسے بزرگوں کے اُستاذ تھے، ایک دن دارالعلوم دیوبند میں قطبی کا سبق پڑھا رہے تھے، یہ منطق کی کتاب ہے، ارسطو کی منطق، جس میں دِین وایمان کے نام کی کوئی چیز نہیں ہے، خالص فنی کتاب ہے، حساب اور ریاضی کی طرح منطق بھی ایک فن ہے، اور مفید فن ہے، قطبی کے سبق کے دوران ہی کسی نے آکر درخواست کی کہ حضرت میرے فلاں رشتہ دار کا انتقال ہوگیا ہے، ایصالِ ثواب کرادیں، تو فرمایا: ٹھیک ہے۔ جب منطق کا سبق ختم ہوا تو طلبہ سے کہا کہ ہم جس نیت سے حدیث اور فقہ پڑھاتے ہیں، اُسی نیت سے منطق بھی پڑھاتے ہیں، اس لئے ہمارا منطق پڑھنا پڑھانا بھی ایک عبادت ہے، تم نے جو سبق پڑھا ہے، اُس کا ثواب فلاں کے والد کو پہنچادو۔

اسلام میں دِین اور دُنیا کی تفریق ہی نہیں، تعلیم کے اندر بھی یہ خلیجیں نہیں تھیں کہ یہ دُنیاوی تعلیم کی درسگاہیں ہیں، وہ دِینی تعلیم کی درسگاہیں، البتہ دُنیاوی تعلیم کی درسگاہیں بھی دِینی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں، وہاں سے ابوریحان البیرونی اور اُن جیسے دوسرے عظیم فلاسفر وحکماء اور اُس وقت کے سائنس دان پیدا ہوئے تو وہ بھی علمِ حدیث، علمِ تفسیر، عربی زبان، فقہ اور اُصولِ فقہ وغیرہ سے بے بہرہ نہیں تھے، بلکہ وہ اُن کا بھی وافر علم رکھتے تھے، اُس زمانے کے مسلمانوں میں فلاسفر بھی تھے، سائنسدان اور اطبّاء بھی تھے، جغرافیہ، ریاضی، علمِ ہیئت اور فلکیات کے ماہرین بھی تھے جو دِینی علوم سے بھی بہرہ ور تھے، لیکن سارے کے سارے سرکاری تعلیمی ادارے دِینی رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے تھے۔

ہندوستان میں بھی مسلمانوں کے دور میں نظامِ تعلیم وہی چل رہا تھا، یہاں کی سرکاری زبان فارسی تھی، اُس زمانے کی سائنس اور دوسرے دُنیاوی علوم ہمارے ہندوستان کے تمام مدارس میں رائج تھے۔ اور اُس وقت کے علماء ان تمام مضامین کو یعنی انجینئرنگ (علم الہندسہ)، حساب، الجبرا، جیومیٹری، علمِ ہیئت اور فلکیات، جغرافیہ اور طب وغیرہ کو اپنے دِینی مدارس میں پڑھتے اور پڑھاتے تھے۔

مسلمانوں کے جامع نظام تعلیم کا زوال: لیکن ہماری شامت اعمال رنگ لائی اور ہماری محکومیت کا دور شروع ہوا، جب انگریز اپنی مکاری اور دھوکہ بازی کے ساتھ تاجروں کے بھیس میں لٹیرے بن کر اور برصغیر پر عذاب بن کر نازل ہوئے۔ انہوں نے اپنی چال بازیوں سے ہندوستان کی زمینوں پر قبضے کرنے شروع کئے اور رفتہ رفتہ چالبازیوں کے ذریعے اپنے قدم جماتے چلے گئے کیونکہ اس زمانے میں ہمارے حکمران وہ سبق بھول چکے تھے، جو قرآن وسنت اور خلفائے راشدین نے امت کو دیا تھا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، محمد بن قاسمؒ، طارق بن زیادؒ، اور قتیبہ بن مسلم باہلیؒ اور دوسرے تمام بزرگانِ دین نے جو کچھ سکھلایا تھا وہ اُسے بھی "قصۂ پارینہ" بنا چکے تھے، شخصی حکومت کی وجہ سے وہ عیاشی اور طرح طرح کی آرام طلبیوں میں گھر گئے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی افواج کا جو سیلاب آیا اس میں وہ خس و خاشاک کی طرح بہتے چلے گئے۔

۱۸۵۷ء کا جہادِ آزادی: اس وقت کے علمائے کرام اور مشائخ عظام نے آخر وقت تک انگریزی حکومت اور انگریزی فوج کا بھرپور مقابلہ کیا، اس سلسلے کی آخری کوشش ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر مرحوم کے دور میں ہوئی، یہ مغل دور کے آخری بادشاہ تھے، مگر ان کی حکومت صرف دہلی کے لال قلعہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، باقی تقریباً سارے ملک پر انگریز کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔

۱۸۵۷ء میں جہادِ آزادی کی تحریک اٹھی اور وہی مقدس جماعت جو دار ارقم اور صُفّہ کے تعلیم یافتہ صحابۂ کرامؓ کی پیروی کر رہی تھی، وہی بوریا نشین مُلّا، وہی مسجدوں کے اِمام، وہی خانقاہوں کے پیشوا، میدان میں آئے، اُن میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تھے، جنہوں نے بعد میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی، اسی طرح حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ، حضرت حافظ ضامن شہیدؒ اور دوسرے علمائے دِین اس جہاد میں پیش پیش تھے، ان حضرات نے تھانہ بھون کے پاس انگریزی فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور جہادِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

لیکن ہمارے اُوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائشوں کا وقت آیا ہوا تھا، اور ہمیں اپنے کئے کی سزائیں ملنے والی تھیں، اپنے ہی بعض مسلمانوں کی غداریوں کی وجہ سے یہ تحریک آزادی شکست سے دوچار ہوئی، اور ہندوستان میں دہلی کے چوراہوں پر پھانسی کے پھندے لٹکائے گئے اور علمائے حق کو ان پر پھانسیاں دے دے کر شہید کیا گیا۔ انگریزوں کی طرف سے ہندوستان کے طول وعرض میں وحشت وبربریت کا جو دور مسلمانوں پر آیا وہ تاریخ کا ایک المناک باب ہے، جلیانوالہ باغ کے سے دلدوز مناظر آج بھی تاریخ کو یاد ہیں۔

مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کی ایک اور خطرناک چال: انگریزی حکومت پورے کرّ وفر کے ساتھ پورے برصغیر پر قابض ہوگئی، یہ چالباز اور دھوکہ باز حکومت تھی، شروع شروع میں ظلم وستم کے پہاڑ توڑے، علمائے حق کو پھانسیوں پر لٹکایا، اس کے بعد انہوں نے امن کا لباس پہنا، تمدن کا لباس پہنا، اپنے بھیڑیئے پن کو کوٹ پتلون میں

چھپانے کی کوشش کی، اور ایسی تدبیریں شروع کیں جس سے مسلمان اپنے قرآن پاک کو بھول جائیں، اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھول جائیں، اپنے دین کو فراموش کر کے ایک غلام قوم کے طور پر اُن کے تابع فرمان ہو جائیں۔

انہیں ہندوؤں سے کوئی خطرہ نہیں تھا، انہیں سب سے بڑا خطرہ مسلمانوں سے تھا، کیونکہ یہ قوم حکمرانی تو جانتی تھی، محکومی اور غلامی سے نا آشنا تھی۔ یہ انگریزی حکومت کو دِل سے قبول کرنے والی قوم نہیں تھی، مسلمانوں کو قابو میں لانے اور اُن پر اپنی گرفت کو مضبوط کرنے کے لئے دِینی مدارس کو بے اثر کر دینا انگریزوں کی سیاسی ضرورت تھی، انہوں نے دینی مدارس پر فوج کشی نہیں کی، بلکہ انہوں نے سب سے پہلے یہ کیا کہ ہندوستان کے سرکاری دفاتر سے فارسی زبان کو ختم کر کے انگریزی زبان مسلط کر دی، جس کا نتیجہ رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ جب اس ملک کے باشندے سرکاری دفاتر میں پہنچتے تو وہ سرکار کی نظروں میں اَن پڑھ اور جاہل تھے، چاہے وہ کتنے ہی اُونچے درجے کے تعلیم یافتہ ہوں، مگر صرف انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے سرکاری اداروں میں وہ جاہل اور اَن پڑھ قرار دے دیئے گئے، وہ سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے سرکاری اسکولوں میں اپنے بچوں کو داخل کرانے پر مجبور ہو گئے، جہاں ایک اجنبی قوم کی زبان اور اجنبی تہذیب و معاشرت کی حکمرانی تھی، اور اسلامی تعلیمات کا داخلہ ممنوع تھا۔

اسلام کسی قوم کی زبان سیکھنے سے منع نہیں کرتا: اسلام کسی قوم کی زبان سیکھنے سے منع نہیں کرتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو یہودیوں کی زبان سیکھنے کا حکم دیا، اور چند ہی دنوں میں حضرت زید ابن ثابتؓ نے یہودی زبان میں مہارت پیدا کر لی، چنانچہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ترجمان تھے، جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہودیوں کو خط بھیجتے تو یہودیوں کی زبان میں ان سے لکھواتے تھے، اور جب یہودیوں کا خط آتا تو حضرت زید ابن ثابتؓ اس کا ترجمہ عربی زبان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کرتے تھے۔ اسلام کسی زبان کا دشمن نہیں ہے۔

انگریزی زبان مسلمانوں پر سیاسی حربے کے طور پر مسلط کی گئی: اسلام انگریزی زبان کا بھی دشمن نہیں، لیکن اُس وقت تو مسلمانوں پر انگریزی زبان ایک سیاسی حربے کے طور پر مسلط کی جا رہی تھی، اسلام کو نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم سے خارج کر دیا گیا تھا، تاکہ مسلمانوں کی نئی نسل اپنی اسلامی روایات اور اپنے ماضی سے رشتہ توڑ کر اپنا قبلہ یورپ اور انگلستان کو بنالے، اور جسمانی محکومیت کے ساتھ ذہنی غلامی کا طوق بھی اپنے گلوں میں ڈال لے، چنانچہ اس زمانے میں ہمارے بزرگوں نے یہی کہا کہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرو، اس لئے کہ ان اسکولوں میں نظامِ تعلیم سیکولر تھا، اُس میں زبان بھی اجنبی، تہذیب و تمدن بھی دوسرے، روایات و آثار بھی دوسری قوم کے۔ خلاصہ یہ کہ ایک غلام قوم تیار کرنے کے لئے جس تعلیم و تربیت کی ضرورت تھی، وہ پوری طرح ان اسکولوں اور کالجوں میں مہیا کر دی گئی تھی۔

(جاری ہے)